(غلام گردش)

بچے، جنہوں نے دنیا تبدیل کردی!

لوئی بریل، فرانس کے تاجر کا بیٹا تھا۔ والد کی ورکشاپ اسکے کھیلنے کی جگہ بن چکی تھی۔ لوئی بچپن سے تجسس رکھنے والے ذہن کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔ تجربات اور نئی جہتوں پر غور کرنے والا معصوم سا بچہ۔ آج سے دو صدیاں پہلے کا فرانس تھا۔ 1809 کا ملک۔ بریل صرف تین برس کا تھا۔ حسبِ معمول والد کی ورکشاپ میں کھیل رہا تھا۔ اسی جگہ پر ایک حادثہ ہوا اور دونوں آنکھیں ضائع ہوگئیں۔ تین برس کی ننھی سی عمر میں بریل اب نابینا تھا۔ شروع میں اسے قطعاً معلوم نہیں ہوا کہ کس درجہ قیمتی آفاقی انعام یعنی آنکھوں کو کھو بیٹھا ہے۔ ہر وقت اپنے والدین سے پوچھتا رہتا تھا کہ اسکے اردگرد ہر وقت اندھیرا کیوں رہتا ہے۔ والدین اسکے سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے۔ صرف یہ کہتے تھے کہ ابھی دن نہیں نکلا۔ روشنی نہیں ہوئی۔ بریل، بینائی نہ رکھنے کی وجہ سے والدین کے آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بچے کو پڑھنے اور لکھنے سے عشق تھا۔ سمجھ چکا تھا کہ اسکی بصیرت ختم ہو چکی ہے۔ مگر اس نے حادثہ کو اپنے لیے سوحان روح نہیں بنایا۔ سکول میں داخلہ لیکر تعلیم حاصل کرنی شروع کردی۔ دس برس کی عمر میں پیرس کی "رائل انسٹیٹیوٹ فار بلائنڈ" میں داخلہ مل گیا۔ وہاں تمام طلباء اور طالبات نابینا تھے۔ بریل نے محسوس کیا کہ اسکول میں بھی پڑھنے کیلئے جو طریقہ کار اپنایا گیا ہے، وہ انتہائی مشکل بلکہ پیچیدہ ہے۔ ابھرے ہوئے لاطینی الفاظ، بڑے ضخیم کاغذ پر نقش کردیے جاتے تھے۔ کتابیں اس درجہ وزنی ہوتی تھیں کہ بچوں کیلئے انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا اَز حد دشوار تھا۔ یہ طریقہ کار ولنٹین ہیوا (Valentin Hauy) نام کے ایک عظیم آدمی نے تشکیل دیا تھا۔ انسٹیٹیوٹ بھی اس نے بنائی تھی۔ ولینٹن نے اپنی پوری زندگی اور جائیداد، بے بصیرت لوگوں کیلئے وقف کرڈالی تھی۔ بریل کے ذہن میں خیال تھا، کہ کسی بھی طرح نابینا انسانوں کیلئے پڑھنے کا کام آسان کردے۔ ایک دن اسے خیال آیا کہ پورے الفاظ کاغذ پر کیوں نقش ہوں۔ بریل نے ایک کاغذ لیا۔ تمام تحریر کو الفاظ کی بجائے چھوٹے چھوٹے ابھرے ہوئے نقطوں میں تبدیل کرڈالا۔ کوئی بھی بچہ اپنی انگلیوں سے ان ابھرے ہوئے نقطوں کو محسوس کرکے الفاظ ترتیب دے سکتا تھا۔ بریل اس وقت صرف پندرہ برس کا تھا۔ بریل نے نابینا انسانوں کے پڑھنے کیلئے ایک ایسے آسان طریقے کی بنیاد ڈالی جو آج تک قائم ہے۔ پندرہ برس کے بچے نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا، جو ہر طریقے سے ایک تعلیمی انقلاب کی بنیاد بن گیا۔ دو صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی بینائی سے محروم لوگ بریل سسٹم کے ذریعے ہی کتابیں پڑھتے ہیں۔ جب تک دنیا قائم ہے، اس بچے کے عظیم کام کی خوشبو قائم و دائم رہے گی۔

کلاڈیٹ کی لون (Claudette Colvin) ایک سیاہ فام بچی تھی۔ الابامہ میں پیدا ہونے والی یہ بچی قطعاً نہیں جانتی تھی کہ اسکی وجہ سے امریکہ میں سیاہ فام لوگوں کا مقدر، قسمت، مستقبل اور حقوق سو فیصد تبدیل ہو جائینگے۔ کلاڈیٹ عام سی لڑکی تھی۔ سیاست سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں تھی۔ 1955 کے امریکہ میں سیاہ فام لوگوں کے عملی طور کوئی حقوق نہیں تھے۔ سفر کے دوران رنگت کی بنیاد پر نشستوں کی تقسیم موجود تھی۔ کالی جلد والے اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھے تھے اور گورے اپنی پر۔ اسکول بھی الگ الگ تھے۔ کالوں کیلئے ہر سہولت گوروں سے الگ تھی۔ اپنے ہسپتال، اپنی آبادیاں اور ایک مخدوش مستقبل۔ عملی طور پر امریکہ میں یہ تمام لوگ دوسرے درجہ کے شہری

اور تیسرے درجہ کے انسان تھے۔اسلیے کہ دوسرے درجہ پر گوروں کے پالتو جانور آتے تھے۔جنکی قدر و منزلت سیاہ فام انسانوں سے بہت زیادہ تھی۔کوئی ایک یا دو صدیوں پرانی بات نہیں۔چند دہائیاں پہلے کی بات ہے۔شہر کا قانون یہ بھی تھا کہ اگر کسی بس میں تمام نشستیں بھری ہوئی ہیں اور کوئی سفید فام مسافر آجاتا ہے تو سیاہ فام مسافر اپنی سیٹ سے اُٹھے گا اور کھڑا ہو جائیگا۔گورا،اس خالی کردہ نشست پر بیٹھ جائیگا۔کسی روایت یا رسم کا ذکر نہیں کر رہا۔یہ الابامہ ریاست کا قانون تھا۔کلاڈیٹ 2 مارچ 1955 کو اسکول سے بس میں واپس آرہی تھی۔سٹاپ پر بس رکی تو ایک سفید فام مسافر بس میں آگیا۔تمام سیٹیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔گورے مسافر کیلئے کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔مقامی قوانین کے تحت ڈرائیور نے بس کے مسافروں کو غور سے دیکھا۔اسے کلاڈیٹ ایک کمزور سی لڑکی نظر آئی جسے اپنی نشست سے آسانی سے اُٹھایا جاسکتا تھا۔ڈرائیور نے پندرہ سالہ بچی کو حکم دیا کہ اپنی سیٹ سفید فام شخص کیلئے خالی کردے۔کلاڈیٹ نے اُٹھنے سے مکمل انکار کردیا۔جواب تھا کہ اس نے بس کا اتنا ہی کرایہ دیا ہے جتنا سفید فام شخص نے۔لہذا اسکے بحیثیت مسافر اتنے ہی حقوق ہیں جتنے کسی گوری چمڑی والے کے۔ڈرائیور کا اس نحیف سی لڑکی کے متعلق اندازہ مکمل طور پر غلط ثابت ہوا۔موقعہ پر پولیس بلالی گئی اور بچی کو گرفتار کرکے پابند سلاسل کردیا گیا۔ضمانت کے بعد جب گھر پہنچی،تو تمام محلّہ اور بالخصوص گھر میں خوف کی فضا تھی۔سب کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ سفید فام غنڈے انکے گھروں کو جلا ڈالے گے اور قتل کردینگے۔بہر حال معاملہ یہاں تک نہیں بگڑا۔مگر کلاڈیٹ کو سکول سے نکال دیا گیا۔وہ نوکری تلاش کرنے جہاں بھی جاتی،اسے ایک باغی اور سازشی انسان قرار دیا جاتا۔نوکری کے تمام دروازے پندرہ سالہ بچی پر بند کردیے گئے۔اب ایک طرف وہ ایک کمزور فریق تھی اور اسکا مقابلہ ایسے نظام سے تھا جس میں صرف سفید فام ہی انسان کہلانے کے حقدار تھے۔کلاڈیٹ مصیبتوں،پریشانیوں اور غربت سے لڑتی رہی۔اس نے چار کالے لوگوں کے ساتھ عدالت عظمیٰ میں جانے کا فیصلہ کیا۔سفید فام لوگوں نے تمام درخواست گزاروں پر بے پناہ دباؤ ڈالا۔ایک درخواست گزار دباؤ کا مقابلہ نہ کرسکی اور مقدمہ سے دستبردار ہوگئی۔مگر کلاڈیٹ نے کسی بھی دباؤ میں آنے سے انکار کردیا۔1956 میں مقدمہ کا فیصلہ ہوا۔یہ تاریخی فیصلہ امریکہ میں انسانی حقوق کی بنیاد بنا۔فیصلہ میں درج تھا کہ بسوں میں سیاہ فام اور سفید فام نشستوں کا مختص ہونا،آئین کے خلاف ہے۔کسی بھی کالی رنگت والے مسافر کو اسکی نشست سے کسی بھی صورت میں محروم نہیں کیا جاسکتا۔اس عظیم فیصلے سے امریکہ میں سیاہ فام انسانی حقوق کی تنظیموں میں جان پڑگئی۔مساوی انسانی حقوق کی تمام جدوجہد صرف اور صرف کلاڈیٹ کے اٹل فیصلے کی بدولت تھی۔تھوڑے ہی عرصے میں سیاہ فام لوگوں نے ایک بھرپور تحریک چلائی اور بالاخر گوروں کے برابر کے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔یہ سب کچھ ایک نحیف اور جسمانی طور پر کمزور لڑکی کی بدولت ممکن ہوا۔

کیٹی سٹاگ لی اینو کی عمر صرف بارہ برس تھی۔بچی نے اردگرد دیکھا تو اسے بہت سے انسان نظر آئے جنہیں دو وقت کا کھانا نصیب نہیں تھا۔کیٹی ایک حساس لڑکی اور ذہین طالبعلم تھی۔اسکے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ کسی غریب کو کھانا خرید کردے سکے۔گھر کے پچھلی طرف ایک بہت چھوٹا سا باغ تھا۔کیٹی نے کتابیں پڑھی اور تحقیق کرتی رہی کہ اتنی محدود سی جگہ پر عام لوگوں کی بہتری کیلئے کیا کرسکتی ہے۔بچی کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا۔باغیچہ میں کیٹی نے گوبھی اُگانی شروع کردی۔تحقیق کے مطابق کھاد،پانی اور نمکیات ڈالنے

سے گوبھی کا ہر پھول بیس کلو وزن کا ہو گیا۔ بچی سکول سے آتی۔ گوبھی کاٹ کر کھانا بناتی۔ بے سہارا اور غریب لوگوں کو انکے گھر پر کھانا دے آتی۔ کچن سے پہلے دن تین سو بندوں کو کھانا مہیا کیا گیا۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ بارہ برس کی لڑکی اتنا نیک کام کر رہی ہے تو انہوں نے اسے مالی امداد فراہم کرنے کی کوشش کی۔ کیٹی نے امداد لینے سے انکار کر دیا۔ اس نے ایک گروپ بنایا جس میں تمام لوگ مختلف جگہوں پر حسب اطاعت فصلیں اُگاتے ہیں۔ صرف دس ماہ میں مفلوک الحال لوگوں میں ہزاروں کلو سبزی، پھل اور کھانا تقسیم کیا گیا۔ اب یہ ایک مہم کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اب کیٹی صرف چودہ برس کی ہے۔ مگر اس نے اتنی ننھی سی عمر میں وہ نیک کام کیا جو لوگ اپنی تمام عمر میں بھی نہیں کر پاتے۔

ہمارے ملک کے بچے اور بچیاں دنیا کے ذہین ترین قوموں کی طرح کے ہی ہیں۔ کسی اعتبار سے بھی کمتر نہیں۔ مگر سوچنے کی بات ہے کہ ہمارے طالبعلم اور طالبات نئی جہتوں پر کیوں غور نہیں کرتے۔ ذہانت اور صلاحیت میں برابری کے باوجود ہمارے بچے کوئی انقلابی کام کرتے ہوئے کیوں نظر نہیں آ رہے۔ اسکی متعدد وجوہات ہیں۔ جیسے ہی بچے بڑے ہوتے ہیں، انکو ایک اَن دیکھے سماجی خوف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ ذہین ترین سوالات کا جواب دینے کی بجائے انہیں ڈانٹ دیا جاتا ہے۔ انکی سوچ پر مختلف طرح کے قفل لگا دیے جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ہمارے باصلاحیت بچے بھی نئے خیال کو سوچنے کی طرف راغب ہونا بند کر دیتے ہیں۔ نوکری، ذریعہ معاش اور معاشرہ کی منافقت انکے ذہنوں پر ہاوی کر دی جاتی ہے۔ قدرت ان بچوں سے فکر کا انعام واپس لے لیتی ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کے عام سے انسان بن جاتے ہیں اور پھر عام سی زندگی گزار کر راہِ فنا کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بچپن کے تجسس کو بھرپور طریقے سے برباد کیا جاتا ہے۔ نتیجہ سامنے ہے کہ وہ ذہنی مفلوج ہجوم میں تبدیل ہو جاتے ہیں، جسکی نہ کوئی منزل ہے اور جسکے پاس نہ ہی کوئی راستہ ہے۔ تمام معاشرہ ایک ایسے ذہنی جوہڑ میں تبدیل ہو چکا ہے جس میں ذہین بچوں کو انکی صلاحیت کے مطابق پھلنے پھولنے کا کوئی موقعہ میسر نہیں ہے۔ یہاں کا تمام سماج نئی سوچ سے بھرپور طریقے سے خوف زدہ ہے۔ یہ خوف کبھی ختم نہیں ہوگا! نئی سوچ کبھی جنم نہیں لے گی!

راؤ منظر حیات